علی گڑھ تحریک اور اردو تنقید

ڈاکٹر ضیاء الحسن☆

Abstract

Aligarh Movement initiated by Sir Syed Ahmed Khan played a pivotal role in awakening the Muslims of the subcontinent. This movement fundamentally was launched to infuse the enlightened spirit of modern education in the subcontinent and especially in the Muslims. The movement attracted the literary giants of the time and hence served the nation from all respects including literary criticism in Urdu. Though, Sir Syed himself could not participate a lot owning to his other more important engagements yet Aligarh offered a platform in this regard. This article is a study of Aligarh Movement's role in the development of literary criticism in Urdu.

علی گڑھ تحریک سے قبل تنقید نگاری تذکرہ نگاری کی صورت میں ملتی ہے۔ اسے ہم تنقید تو نہیں البتہ تنقید کے اولین نقوش قرار دے سکتے ہیں۔ تنقید کے حوالے سے خود سر سید کے ہاں تو کوئی بہت زیادہ کام نظر نہیں آتا لیکن حالی، شبلی اور آزاد کے کام کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات صرف سر سید کے رفقا پر ہی نہیں ہوئے بلکہ بہت سے ایسے ادیب جو اس تحریک سے براہ راست منسلک نہیں تھے اس سے متاثر ہوئے۔ سید احمد دہلوی کی ''رسوم ہند'' سید علی بلگرامی کے تراجم، امداد امام اثر کی تنقید پر اس تحریک کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، کلیہ شرقیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

اسی طرح اس تحریک کی مخالفت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں میں مولوی علی بخش شرر، سید امداد علی، سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، سید محمد آزاد اور اکبر الہ آبادی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات نے سنجیدگی سے سرسید کے نظریات کی مخالفت کی اور بعض نے ظرافت کے رنگ میں اس تحریک کا مضحکہ اڑایا۔ علاوہ ازیں مذہبی حوالے سے بھی اس تحریک کی مخالفت میں علماء کا ایک پورا گروہ نظر آتا ہے جو سرسید کے مذہبی نظریات سے خصوصاً اختلاف رکھتا تھا۔

علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد ادب کی اصلاح و ترقی نہیں تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے ادب مسلمانوں کی اصلاح کے وسیلے کے طور پر اختیار کیا لیکن اس تحریک نے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ اردو ادب میں نثر کے حوالے سے جو بھی ترقی ہوئی اس میں اس تحریک کا بنیادی حصہ ہے۔ شاعری کے حوالے سے بھی انقلابی تبدیلیاں آئیں اور شاعری کو قوم کی اصلاح کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس حوالے سے حالی کی مسدس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شاعری کے موضوعات، اصناف اور اسلوب ہر سطح پر تبدیلیاں آئیں۔ نثر کے حوالے سے بھی نئی نئی اصناف اردو ادب میں شامل ہوئیں۔

سرسید احمد خان کے کام کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۸۵۷ء سے قبل اور دوسرا دور ۱۸۵۷ء کے بعد کی تنقید کا۔ اگرچہ سرسید احمد خان کا وہ کام جس کی بنیاد پر وہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان دانشور اور ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے لیکن ان کے ابتدائی کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں آثار الصنادید جیسی وقیع کتاب بھی شامل ہے۔

سرسید احمد خان نے ۱۸۴۷ء میں اپنے زمانے کے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا ایک جامع تذکرہ مرتب کیا۔ یہ ان مشاہیر کا تذکرہ ہے جو اپنے زمانے میں کسی نہ کسی حیثیت سے معاشرے میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر بزرگ ایسے ہیں جن کا ذکر صرف اسی تذکرے میں ملتا ہے اور اگر سرسید نے ان کا حال تحریر نہ کیا ہوتا تو آج ہم ان کے نام تک سے واقف نہ ہوتے۔ اس تذکرے کے حوالے سے محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

''اس تذکرے کو مرتب اور مدون کرنے میں سرسید کو دوڑ دھوپ، تگ و دو اور سعی

وکوشش کرنی پڑی ہوگی اور حالات وواقعات کی تلاش میں کس کس کی خوشامد نہ کرنی پڑی ہوگی، جب جا کر یہ بے نظیر تذکرہ مرتب ہوا ہوگا۔ اس میں سرسید نے دس قسم کے ایسے کملائے عصر کے سوانحی حالات جمع کیے تھے جو اپنے اپنے فن میں اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے اور جن کا مثل دہلی کی خاک سے پھر پیدا نہ ہو سکا۔ اس تذکرے میں کل ۱۱۹ لوگوں کا حال تھا"۔(۱)

یہ تذکرہ انھوں نے "شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان" کے عنوان سے اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" کے آخر میں لگایا تھا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا، لیکن دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں اس تذکرے کو کتاب سے خارج کر دیا۔ محمد اسماعیل پانی پتی نے اسے مقالات سرسید جلد شانزدہم میں شامل کیا ہے۔ اس میں دہلی کے شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے جو ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے سترہ شعرا کے حالات درج کیے ہیں۔

سرسید احمد خان کو شعر و ادب کے بارے میں اپنے خیالات ونظریات کو باقاعدہ شکل میں ترتیب دینے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچا۔ اپنے زمانے کے ادب کی خامیوں اور خرابیوں کی طرف توجہ دلائی اور ان سے بچنے کی راہیں ہموار کیں۔ سرسید کے تنقیدی نظریات پر ان کے عہد کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ عہد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے زوال کا ایک مشکل عہد تھا اور سرسید مسلمانوں کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے ایک جہد مسلسل میں مصروف تھے۔ وہ ادب کو فلسفیانہ موشگافیوں اور حصول مسرت تک محدود نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ اسے ملک وملت کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اردو کے شعری ونثری ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو اسے زندگی کے مسائل ومعاملات سے بے پروا دیکھا۔ شاعری عشقیہ وصوفیانہ مسائل تک محدود تھی۔ زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مبالغہ آرائی کی وجہ سے شعر کی دنیا ایک چیستاں بن کر رہ گئی تھی۔ سرسید نے شاعری کی اس خامی کی طرف شاعروں اور نقادان ادب دونوں کی توجہ دلائی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''لیاقت شاعر کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال وخط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہوجاتے ہیں''۔(۲)

ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے بجا طور پر سرسید احمد خان کو برصغیر میں عقلیت پسندی کا اولین رہنما قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''آخر کوئی سات سو سال تک عقلیت کی مخالفت کے بعد ہندوستان میں ایک بار پھر عقلیت پسندی کی تحریک نمودار ہوئی۔ اس تحریک کی ابتدا سرسید احمد خان نے کی''۔(۳)

اس عقلیت پسندی سے انھوں نے اردو ادب کا جائزہ لیا تو اسے زندگی سے بہت دور پایا۔ سرسید نے اپنی کوششوں سے اس جامد ادب میں زندگی کا تحرک پیدا کیا اور اسے انسانیت کی فلاح واصلاح کے قابل بنایا۔ سرسید براہ راست اظہار کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شعر میں تاثیر جذبہ و احساس اور خلوص سے پیدا کرنی چاہیے، نہ کہ مبالغہ سے۔ وہ چاہتے تھے کہ شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے۔ انھوں نے نیچرل شاعری کی پرزور حمایت کی۔ نیچرل شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جو فطرت کے اصولوں کے مطابق ہو یعنی وہ فنی، ہیتی، اسلوبیاتی اور موضوعاتی سطوح پہ فطرت کے قریب ہو۔

سرسید تحریک بنیادی طور پر نثر کی تحریک ہے لیکن وہ شاعری کے خلاف نہیں تھے۔ ابتدا میں وہ خود بھی شاعری کرتے رہے لیکن ان کا میلان طبع شاعری کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے بعد میں اسے ترک کر دیا۔ غزل سے انھیں ریزہ خیالی اور موضوعاتی یک رنگی کا شکوہ تھا۔ لکھتے ہیں:

ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی''۔(۴)

اس لیے انھوں نے نظم کی حوصلہ افزائی کی۔ جب آزاد کی مثنوی ''خواب امن'' انھیں موصول ہوئی تو انھوں نے اس کی خوب تعریف کی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے کلام کو اور بھی زیادہ فطرت کے قریب کریں کیونکہ شاعری جتنی زیادہ فطرت کے قریب ہوگی اتنی ہی پر تاثیر بھی ہوگی۔ اسی طرح انھوں نے حالی کی مثنویوں ''حب وطن'' اور ''مناظرہ رحم و انصاف'' کو اپنے ادب کا کارنامہ قرار دیا۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان اور عمدگی خیال کو خوب سراہا۔ انھوں نے حالی کو بھی یہی مشورہ دیا کہ نیچرل شاعری کی اس روش کو مزید آگے بڑھائیں کیونکہ اردو شاعری کو اس کی بے حد ضرورت ہے۔

سرسید کی جدیدیت نے اس رمز کو پا لیا تھا کہ قافیہ و ردیف کی پابندی خیالات کو بھی پابند کر دیتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے بے قافیہ نظم کی تخلیق پر زور دیا۔ لکھتے ہیں:

''ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر کوئی کارواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی''۔(۵)

سرسید احمد خان کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ اردو نثر کی اصلاح و ترقی ہے۔ اگرچہ سرسید سے پہلے غالب اور فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کے حوالے سے اہم خدمات انجام دی تھیں لیکن جس طرح سرسید اور ان کے رفقا نے اردو نثر کے اسلوب میں سادگی اور سلاست پیدا کی، اس کے بعد اردو نثر اپنے بام عروج پر پہنچ گئی اور اس مقام پر آ گئی جہاں اس کے ذریعے دنیا کے تمام علوم و فنون اپنا اظہار پانے لگے۔

سرسید احمد خاں قدیم اسلوب کی خرابیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے قدیم اسلوب کو لفظوں کے جمع کرنے، ہم وزن اور قریب اللفظ کلموں کو ملانے، دور از کار

خیالات اور مبالغہ آمیز باتوں کو لکھنے تک محدود قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرز تحریر میں تصنع کی وجہ سے نہ تو بات سمجھ آتی ہے اور نہ ہی اس کا اثر دلوں پر ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''تک بندی سے جو اس زمانے میں منتہی عبارت کہلاتی تھی، ہاتھ اٹھایا، جہاں تک ہو سکا عبارت پر توجہ دی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے''۔(۶)

ادب کے بارے میں سرسید احمد خان افادی نقطۂ نظر کے قائل تھے۔ وہ ادب کو محض تفریح، آرائش یا حصول مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے کسی نہ کسی مقصد کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا مقصد معاشرے کی اصلاح اور تعلیم تھا۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کو ادب برائے زندگی پر ایمان تھا۔ ان کے نزدیک ادب محض ادیب کی تالیف قلب کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ قاری کی تربیت ذہنی کا بھی پابند تھا۔ اردو تنقید میں انھوں نے پہلی دفعہ قاری کی موجودگی کا احساس پیدا کیا اور ادیب کو شعوری طور پر پابند کیا کہ وہ معاشرے کے حوالے سے بھی ادب تخلیق کرے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ادیب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ قاری کی اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے اور یوں مصنف، تخلیق اور قاری کی ایک ہم رشتہ تثلیث قائم کر دی ہے۔ واضح رہے کہ سرسید نے مضمون کو طرز ادا پر فوقیت دی ہے لیکن انشاء کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور طرز ادا میں مناسب لطف پیدا کرنے اور قاری کو سحر اسلوب میں لینے کی تلقین کی ہے''۔(۷)

اردو تنقید میں سرسید پہلے نقاد ہیں جنھوں نے انشاء پردازی پر مضمون کو فوقیت دی ہے۔ ان کے نزدیک بے معنی استعارات و تشبیہات اور فضول تک بندی سے ادب میں تخلیقی عناصر پیدا نہیں ہوتے بلکہ مصنف کا درد دل اور خلوص جذبات حسن و تاثیر کا باعث بنتے ہیں۔ خلوص جذبات اور

دردمندی زندگی کی سچی اورفطری تصویر کاری سے پیدا ہوتی ہے۔

سرسید نے محض سادگی اور سلاست پر ہی ضرور نہیں دیا بلکہ ان کے نزدیک ہر صنف کی اپنی زبان ہوتی ہے اور اسے اس مخصوص زبان میں ہی لکھنا چاہیے۔سرسید کی تحریروں میں ہمیں یہ تفریق عملی طور پر بھی نظر آتی ہے۔ان کے علمی مضامین کی زبان اور ہے اور تمثیلی مضامین کا اسلوب دیگر۔اپنے اس تنقیدی نظریے کا اطلاق انھوں نے اپنی تاریخ نگاری پر بھی کیا۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آثار الصنادید کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کی زبان مختلف ہے۔وہ تاریخ نگاری میں شبلی کی الماموں کے اندازبیاں کے قائل تھے۔

الماموں کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم خیال رکھا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہو۔تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے''۔(۸)

اردو ادب پر سرسید احمد خان کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ان کے رفقا نے ان کے خیالات سے خوب فیض حاصل کیا۔آخر آخر آ کر ان کے بیشتر مخالفین بھی ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ سرسید نے ادب کو عبارت آرائی اور خیال آرائی سے نکال کر ٹھوس مادی حقائق سے روشناس کرایا اور ادب کو صحیح معنوں میں تنقید حیات بنا دیا۔ان کے تمام علمی و ادبی کام کی طرح ان کی تنقید پر بھی عقلیت پسندی، مادیت پسندی، حقیقت پسندی اور مقصدیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ان کے ان نظریات کا پورے اردو ادب پر اثر پڑا اور یوں وہ ایک مختصر دور کے نتیجے میں انقلابی تبدیلیوں سے روشناس ہوا۔انھوں نے اردو ادب کے جمود کو توڑ کر اس کو وسعت بخشی۔

سرسید احمد خان کی تنقیدی بصیرت پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ان کے زیر اثر دیگر کئی نقادوں نے لکھا کہ سرسید نے خود تو باقاعدہ تنقید نہیں لکھی لیکن ان کے تنقیدی نظریات، ان کے رفقا

خصوصاً حالی نے مربوط کیے اور باقاعدہ تنقید کی بنیاد رکھی۔ اس قسم کی باتوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ حالی کی اپنی تنقیدی بصیرت تو نہیں تھی، البتہ انھوں نے سرسید کے نظریات کو مربوط کر دیا۔ اس نقطۂ نظر سے نہ تو سرسید کی عظمت میں اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی حالی کی ادبی حیثیت پر کوئی فرق پڑا ہے۔ ادب کے بارے میں سرسید اور حالی کے بنیادی نظریات ایک تھے کیوں کہ ان کا مقصد حیات ایک تھا لیکن سرسید کو اپنے دیگر منصوبوں سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ ان نظریات پر تنقید کی عمارت کھڑی کرتے۔ حالی کی تنقید پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر سرسید تنقید لکھتے تو یقیناً کچھ باتوں میں وہ حالی کے ہم خیال ہوتے لیکن بہت سی باتوں میں ان کا انداز اختلافی ہوتا، خصوصاً شاعری کے تخلیقی عناصر کے حوالے سے جو مباحث مولانا حالی نے چھیڑے ہیں، وہ سرسید احمد خان کے دائرۂ ضرورت سے باہر ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری سے قبل اردو میں تنقید بالکل ابتدائی شکل میں موجود تھی اور زیادہ تر عملی تنقید کے نمونے ملتے تھے۔ سب سے پہلے شاعری کے حوالے سے اصول و نظریات مولانا الطاف حسین حالی نے وضع کیے۔ حالی ذہنی طور پر سرسید تحریک سے وابستہ تھے جس کی بنیادی خصوصیات عقلیت پسندی، حقیقت پسندی، فطرت پسندی تھیں اور جس کا بنیادی مقصد معاشرتی اصلاح تھا۔ اس لیے حالی نے شاعری کا تعلق معاشرے سے قائم کیا۔

مولانا حالی کا ادب کے بارے میں نظریہ خالص مادی نظریہ ہے۔ وہ ادب سے مادی تقاضے کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ادب کے روحانی اور جمالیاتی وظیفوں سے ناواقف ہیں۔ شعر کی تفہیم اور وضاحت کے بارے میں انھوں نے مختلف مقامات پر جو کچھ لکھا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ شاعری کی فہم کی تمام تخلیقی سطوح سے آگاہ تھے لیکن ان کا عہد جن مسائل سے دوچار تھا، وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ ادب اور شاعری بھی قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے۔

مولانا حالی کے زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ شاعری دور زوال میں ترقی کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا اس لیے سیاسی زوال کو تہذیبی زوال بھی سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی

تہذیبی زوال بھی شروع ہو جائے۔تہذیب سیاست سے بڑی حقیقت ہوتی ہے اس لیے ہر بڑی حقیقت کی طرح اس کا زوال بھی دیر سے شروع ہوتا ہے۔

مولانا حالی شعر وادب میں جمود کے قائل نہیں تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ شاعری جوں جوں آگے بڑھتی ہے، نئے نئے استعارات اور تشبیہات وضع ہوتی ہیں۔نئے نئے خیالات شاعری میں جگہ بناتے ہیں۔وہ ان نقادوں میں سے نہیں ہیں جو ادب میں آنے والے برے ادوار سے مایوس ہو کر ادب کی موت کا اعلان کر دیں بلکہ وہ اسی جمود میں سے تحرک پیدا کرنے کے لیے نظریات وضع کرتے ہیں اور ان نظریات پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مائل کرتے ہیں۔

تہذیب کے شاعری پر اثرات کے ساتھ مولانا حالی شاعری کے انسانی طبائع پر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔اگر چہ اس موضوع پر بھی ان کے ذہن اور خیالات میں صفائی موجود ہے اور وہ شعر کے انسان کے پاکیزہ جذبات پر اثر کے طریقہ کار سے بھی واقف نظر آتے ہیں لیکن مثال دیتے ہیں تو ایک محدود اخلاقیات کا تصور ابھرتا ہے۔ایسے موقع پر بہت سے جدید نقاد فوراً اپنے ہتھیار لے کر ان پر پل پڑتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔قومی افتخار، قومی عزت، عہد و پیمان کی پابندی، بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے، استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اس قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی ہے اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے۔اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلاشبہ ان کی بنیاد تو اس میں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے''۔(۹)

کلیم الدین احمد حالی کے اس اخلاقی نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ مختلف قومیں

مختلف زمانوں میں مختلف اخلاقی اقدار کی حامل ہوتی ہیں، اس لیے اخلاقیات کو محض قومی عزت، قومی افتخار، پاک ذریعوں سے حاصل ہونے والے فائدوں تک محدود کرنا سطحیت اور شعر نافہمی ہے۔ شعر کا وظیفہ یہ کبھی بھی نہیں رہا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں جب لکھ رہے تھے تو ان کی نظر حالی کے ان فقروں پر بالکل نہیں گئی اور انھوں نے ان کی معنویت پر غور کرنے کی زحمت بالکل نہیں کی۔

''۱- شعر اگر چہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔

۲- ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے''۔(۱۰)

یہ بات درست ہے کہ مولانا حالی معلم اخلاق ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ وہ جس اخلاقیات کی بات کرتے ہیں وہ بھی محدود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اخلاقیات کے بارے میں جانتے بھی نہیں ہیں۔ وہ اخلاقیات کی وسعت سے واقف ہیں لیکن ان کا زمانہ اخلاقیات کے جن حصوں کا متقاضی تھا انھوں نے مقدمہ میں ان کی بات کی ہے۔

حالی اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب اور سماج کا تعلق قائم کیا۔ انھوں نے شاعری پر معاشرے اور معاشرے پر شاعری کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مثالیں پیش کی ہیں کہ یہ عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ان کے یہ خیالات ان کے سماجی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگر چہ مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید عمرانی افکار سے آگاہ نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ادب اور سماج کا رشتہ قائم کرنے میں جس شعور کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی نظریاتی پختگی کی دلیل ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اس وقت کے ادب اور معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت تھی جسے مولانا حالی نے نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

اس بحث کے ضمن میں مولانا نے ایک اور بحث بھی چھیڑی ہے کہ شخصی حکومتیں شاعری پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں اور قومی حکومتوں میں کس قسم کی شاعری وجود میں آتی ہے۔ شخصی حکومتوں میں شاعری خصوصاً قصیدہ گوئی دربار تک رسائی اور بادشاہ وقت کے تقرب کا ذریعہ بنتی ہے۔ پرانے وقتوں میں

بادشاہ اوران کی پیروی میں امراووزراءاپنے ساتھ شاعروں کومنسلک رکھتے تھے۔دیگرعلوم وفنون کے ماہرین کی طرح شاعربھی کسی دربار کی عظمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔کسی دربار سے زیادہ شاعروں کا منسلک ہونا باعث فخر تھا۔اسی لیے بادشاہ جی کھول کرشاعروں کونوازتے اورجواب میں توقع رکھتے کہ ان کے کمالات، ان کی شجاعت،سخاوت وانصاف وغیرہ کی مبالغہ آمیز تعریف کی جائے اورشاعرجس کے معاشی مفادات دربار سے وابستہ ہوتے تھے اس کام کے کرنے پرمجبور تھے۔

حالی کا یہ نظریہ ایک بے حدترقی پسندنظریہ تھا۔بعد میں ترقی پسندوں نے اس سے بہت کام لیا۔اگر چہ ان کامآخذ حالی کے بجائے ترقی پسند فکرتھی۔ان کا خیال بھی یہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہ شاعر اورشاعری دونوں کا استحصال کرتے ہیں۔ایسے ادوار میں شاعری کوآزادانہ پنپنے کا موقع کم ملتا ہے جس کی وجہ سے جاگیرداری نظام میں اعلیٰ شاعری کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اسی جاگیرداری نظام میں دنیا بھر میں اعلیٰ ادب بھی تخلیق ہوا۔لکھتے ہیں:

> ''خودمختار بادشاہ جن کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہوتا اورتمام بیت المال جن کا جیب خرچ ہوتا ہے، ان کی بے دریغ بخشش شعرا کی آزادی کے حق میں سم قاتل ہوتی ہے۔وہ شاعر جس کوقوم کا سرتاج اورسرمایہءافتخار ہونا چاہیے ایک بندۂ ہواوہوس کے دروازے پر دریوزہ گروں کی طرح صدا لگاتا اورشیئاًللہ کہتا ہوا پہنچتا ہے''۔(۱۱)

حالی مدلل انداز میں مختلف اقوال اوراشعار کی مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ شاعری کے لیے وزن اورقافیہ غیرضروری ہیں بلکہ بعض اوقات یہ دونوں تخیل کومحدودکردیتے ہیں۔ان کے علاوہ وہ صنائع بدائع کوبھی شاعری کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہیں۔ان پابندیوں سے شعر میں حسن اورتاثیر پیدا ہونے کے بجائے شاعری کا رستہ بند ہوتا ہے۔شاعرفطری شاعری کرنے کے بجائے انہی کا التزام کرنے کی طرف متوجہ رہتا ہے جس کی وجہ اس کے تخیل کو اپنا کا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔البتہ وہ ان پر پابندی بھی نہیں لگاتے۔اگر تخیل کی کارفرمائی میں شعر میں کوئی صنعت خود بخود آجاتی ہے تو اس

میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایسے فطری انداز میں آئی ہوئی صنعت زیادہ حسن اور تاثیر کا باعث ہوتی ہے۔ شاعری کے لیے وہ تین شرطوں یعنی تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخیل ایسی قوت ہے جو شاعر کو زمان و مکان سے ماورا کر دیتی ہے اور وہ جو کہتا ہے ایسے سلیقہ سے کہتا ہے کہ وہ فطری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد حالی شعر کے لازمی خصائص بیان کرنے میں جن سے کوئی شعر اعلیٰ یا ادنیٰ قرار پاتا ہے۔ وہ ملٹن کے حوالے سے کہتے ہیں کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ سید محمد نواب کریم لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں کلیم الدین اور ڈاکٹر احسن دونوں نے لفظ اصلیت پر اعتراض کیا ہے۔ دونوں کہتے ہیں کہ ملٹن نے جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ تھے Passionate sensuous, simple جن کا ترجمہ علی الترتیب سادہ، احتساسی اور پر جوش ہونا چاہیے۔ اول اور آخر کے ترجمہ میں تو حالی نے غلطی نہیں کی لیکن Sensuous کا ترجمہ اصلیت غلط ہے''۔(۱۲)

اس سلسلے میں ہمیں نواب صاحب سے یہ عرض کرنا ہے کہ Sensuousness حالی کا مسئلہ نہیں تھا اور نہ ملٹن کے خیالات کو بیان کرنا ان کا مقصد تھا۔ حالی کا مقصد تو اردو شاعری کے لیے اصول مرتب کرنا تھا تا کہ ایک ایسی شاعری وجود میں آ سکے جو مسلمان قوم کا مورال بلند کر کے اسے اعلیٰ تہذیبی، سیاسی زندگی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن ہونے کے لیے متحرک کرے۔ ظاہر ہے ایسی شاعری جس کی خوبی Sensuousness ہو اس مقصد کے لیے مددگار ثابت نہیں ہو سکتی تھی اس لیے حالی نے Sensuousness کے متبادل کے طور پر اصلیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری کا دوسرا حصہ چند اصناف شعر کے تجزیہ اور اصلاح سے مخصوص ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سب سے پہلے غزل کو منتخب کیا ہے کیونکہ یہ صنف مرغوب خاص و عام ہے۔ غزل کے حوالے سے بھی انھوں نے وہی خامیاں بیان کی ہیں جو انھوں نے نظری مباحث میں شاعری کی

گنوائی ہیں کہ غزل چند موضوعات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کی وجہ سے اس میں تاثیر باقی نہیں رہی۔ پھر یہ موضوعات بھی سینکڑوں سالوں سے اردو فارسی شاعری میں بیان کیے جاتے رہے ہیں اور اب ان میں تازگی اور ندرت باقی نہیں رہی۔ غزل محض خیالی موضوعات کا مرکب بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں سادگی اصلیت اور جوش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تفصیل سے بچتے ہوئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ غزل میں بھی وہی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں جو شاعری کے لیے انھوں نے بیان کی ہیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انھوں نے جہاں غزل کی تعریف کی ہے اعلیٰ شاعروں کی مثالیں دی ہیں اور جہاں وہ اس سے نالاں ہیں وہ دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کی شاعری ہے جو غزل کے موضوعات کو تقلید آموزوں کرنے کا کام کرتے رہے ہیں۔

حالی کے غزل کی صنف پر اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''وہ اس سے بے زار ہیں لیکن اسے خارج کر دینے کے حق میں نہیں۔ وہ اس میں وسعت اور اصلاح چاہتے ہیں اور اس اصلاح کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ موجودہ غزل اسی سانچے میں ڈھل گئی ہے۔ یہ حالی کا فیض ہے''۔(۱۳)

غزل کے بعد انھوں نے قصیدہ اور مرثیہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ان دونوں اصناف کو ادب کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں لیکن اردو زبان میں ان کے حوالے سے جو سرمایہ موجود ہے وہ اس کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قصیدہ اردو شاعری میں اپنے اس وسیع مفہوم میں رائج نہیں رہا اور زیادہ تر بادشاہوں اور صاحبان اقتدار و اختیار کی جھوٹی مدح سرائی کے کام آتا رہا ہے یا دشمنوں کی غلط ہجو گوئی میں استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے اس صنف کی توقیر اردو شاعری سے نہیں ہو سکی۔ وہ مرثیہ کے قائل ہیں اور اردو مرثیہ خصوصاً میر انیس کی شاعری کے مداح ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس صنف کو بھی محض واقعہء کربلا سے مخصوص نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس صنف کے تقاضوں کے مطابق اسے وسعت دینی چاہیے ورنہ واقعہ کربلا سے متعلق مرثیہ کو میر انیس نے اس بلندی تک پہنچا دیا ہے کہ اب مزید نئے شاعروں کی اس صنف میں طبع آزمائی کا کوئی فائدہ نہ شاعری کو ہے اور نہ ہی ان شاعروں کو ہوگا۔

آخر میں حالی نے مثنوی کی صنف کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ صنف موجودہ دور کی عکاسی کے لیے بہترین ہے۔ کیونکہ ایک تو اس میں غزل قصیدہ یا مرثیہ کی طرح قافیہ کی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ ہر بیت میں قافیہ بدل جاتا ہے جو مضمون کو آزادی سے بیان کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے جو موجودہ حالات میں بے حد ضروری ہے۔ آج کے دور میں غزل کی ایمائیت اور اختصار کی نسبت نظم کی تفصیل اور ارتباط ضروری ہے۔ پھر وہ اردو فارسی مثنویوں کا جائزہ لے کر ان کی خوبیوں خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثنوی کی اصلاح کے لیے بھی ان کے وہی پیمانے ہیں جو انھوں نے اپنی نظری تنقید میں بیان کیے ہیں اور غزل قصیدہ اور مرثیہ پر لاگو کیے ہیں۔

مولانا حالی کی تنقید کے خلاف مختلف حوالوں سے بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اختلاف رکھنے والے بھی ان کے کام کی سنجیدگی اور اہمیت کے قائل ہیں۔ حق میں لکھنے والوں نے بھی کئی حوالوں سے ان کے نظریات پر گرفت کی ہے۔ سب سے زیادہ اس پر اعتراض ہوا کہ مولانا نے مغربی ادب کے جو حوالے مقدمہ میں نقل کیے ہیں یا تو غلط ہیں یا سند کا درجہ نہیں رکھتے لیکن ایک بات کا سبھی نقادوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا حالی ہی وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب، زندگی اور سماج کا رشتہ قائم کیا ہے۔ ان کی تنقید کی بنیاد سماجیات پر قائم ہے۔ یہ ان کے عہد کی ضرورت بھی تھی اور اردو تنقید کی بھی سرسید تحریک عموماً اور مولانا حالی کی تنقید خصوصاً اس حوالے سے قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے نئی زندگی اور نئے ادب کے دروازے کو برصغیر کے عوام کے لیے وا کیا۔

شبلی بنیادی طور پر مشرقی مزاج کے حامل تھے اس لیے ان کی تنقید میں بھی مشرقیت نمایاں ہے۔ وہ شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ شبلی کو اکثر نقادوں نے جمالیاتی اور تاثراتی دبستان تنقید سے منسلک کیا ہے۔

شبلی کی تنقید جمالیاتی اصولوں سے ترتیب پاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے ہاں سماجی حوالے موجود ہی نہ ہوں۔ شبلی جیسی وسیع الجہت شخصیت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ صرف ایک ہی حوالے سے تنقید لکھتے ہوں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی کے ہاں اصلاحی عنصر نمایاں ہے اور شبلی

کے ہاں جمالیاتی۔ ویسے بھی سرسید کی اصلاحی تحریک سے وابستہ ادیب کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ مقصدیت اور اصلاحی نقطۂ نظر سے بالکل بے گانہ ہو۔ پھر شبلی کا تاریخی شعور بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ ادب پر ہونے والے معاشرتی وعمرانی اثرات کو نظر انداز نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی تنقید میں مضبوط عمرانی حوالے مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی تنقید صرف تاثراتی ہی ہے کیونکہ وہ ایک گہرا تاریخی ومعاشرتی شعور بھی رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ ادب میں ایک طرف سیاسی ردوبدل کے اثرات دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں''۔(۱۴)

شبلی کی تنقید میں شعرالعجم جلد چہارم کو وہی مقام حاصل ہے جو حالی کی تنقید میں مقدمہ شعر وشاعری کو شعر کی ماہیت، تخیل، الفاظ اور ان کے استعمال، سادگی، اصلیت، شعر کی تاثیر، نظام حکومت کا شاعری پر، تخصی حکومت کا شاعری پر، معاشرت کا شاعری پر اثر وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں دونوں نقادوں نے اپنی کتابوں میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ کہیں ان کی آرا میں اتفاق اور کہیں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ ایک نے کسی موضوع کو ضروری خیال کرتے ہوئے اس پر زیادہ تفصیل سے لکھا ہے تو دوسرے نے اور موضوع پر۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ دونوں کے ایک دوسرے کے تنقیدی نظریات پر کچھ نہ کچھ اثرات اور دونوں پر سرسید کے نظریۂ ادب کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

شعرالعجم جلد چہارم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شعر کی ماہیت پر بحث ہے۔ دوسرے حصے میں فارسی شاعری کے پس منظر میں شعر اور معاشرت کے مختلف اجزا کے اثرات پر بحث ہے اور تیسرے حصے میں فارسی شاعری پر تبصرہ ہے۔ پہلے اور تیسرے باب میں جزوی طور پر عمرانی حوالے موجود ہیں ورنہ ان ابواب پر جمالیاتی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے اور جس کی وجہ سے شبلی کو جمالیاتی تنقید کے دبستان سے منسلک کیا جاتا ہے۔ شبلی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک

شعر کا نمایاں ترین وصف جذبات انسانی کو برانگیختہ کرنا ہے۔ حالی شعر کے اس وصف کو قوم کی اصلاح کے لیے استعمال کرنے کے حق میں ہیں جبکہ شبلی اسے داخلی کیفیت قرار دیتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شاعری لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ ہے یعنی وہ قاری کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں جبکہ شبلی کہتے ہیں کہ ''اصلی شاعری وہ ہے جس کو سامعین سے کوئی غرض نہ ہو۔ حالی شاعری کے لیے متخیلہ کو لازمی سمجھتے ہیں اور شبلی بھی۔ لیکن شبلی محاکات کو بھی شعر کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں۔ حالی صنائع بدائع کو شاعری کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں جبکہ شبلی ضروری سمجھتے ہیں۔

شعر العجم جلد چہارم میں پہلی اہم بحث سادگی کے بارے میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سادگی ادا سے مراد یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا جائے۔ بے تکلف سمجھ میں آ جائے۔ اس کے لیے وہ چند ضروری باتوں کی پابندی عاید کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

''۱- جملوں کے اجزا کی وہ ترتیب رکھی جائے جو عموماً اصلی حالت میں ہوتی ہے۔

۲- مضمون کے جس قدر اجزا ہیں ان کا کوئی جزو رہ نہ جائے۔

۳- استعارے اور تشبیہیں دور از فہم نہ ہوں۔

۴- تلمیحات ایسی نہیں ہونی چاہیں جو کسی کو معلوم نہ ہوں۔

۵- سادگی ادا میں اس بات کو بہت دخل ہے کہ روزمرہ اور بول چال کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ روزمرہ چونکہ عام زبانوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے اس لیے ایک لفظ ادا ہونے کے ساتھ فوراً پورا جملہ ذہن میں آ جاتا ہے اور اس کے سہارے سے مشکل سے مشکل مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے''۔(۱۵)

اس اقتباس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ وہ قاری کی اہمیت کے قائل ہیں دوسرے یہ کہ وہ شعری زبان کو نثر کی ترکیب اور روزمرہ بول چال کی زبان کے قریب لانا چاہتے ہیں۔ روزمرہ بول چال کی زبان معاشرتی میلانات و رجحانات و نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہی بات تیرہویں، چودھویں صدی عیسوی میں دانتے نے اپنے مضمون ''عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال'' میں کہی

تھی۔ اگر چہ شبلی پر دانتے کے اثرات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دور کے ادب کے مسائل کے حوالے سے اسے ضروری سمجھتے ہیں لیکن دانتے اور شبلی دونوں اپنی اپنی زبان کے ادب کے ابتدائی زمانے کے نقاد ہیں اور دونوں کو ادب میں ایسے ہی مسائل درپیش تھے۔ دونوں نے زبان کے معاملے میں اپنے اپنے ادوار کی عمرانی ضرورتوں کو محسوس کرلیا تھا۔

اس کے بعد شبلی نے واقعیت یا اصلیت کی بحث چھیڑی ہے اور اسے شعر میں تاثیر پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔ مولانا حالی کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا۔ وہ شعر میں واقعیت یا مبالغہ کے عناصر کو تمدنی اثرات کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''یہاں ایک خاص نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے، شاعری اور انشا پردازی تمدن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے یعنی جس قسم کا تمدن ہوتا ہے اسی قسم کی شاعری بھی ہوتی ہے۔ قوم کی ابتدائی ترقی کا جو زمانہ ہوتا ہے، اس وقت شاعرانہ خیالات سادہ ہوتے ہیں۔ جب قوم ترقی کرتی ہے اور تمام شریفانہ جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں تو کو شاعری میں جوش اور زور پیدا ہوجاتا ہے لیکن اب بھی سچائی اور راستی کے مرکز سے نہیں ہٹتی کیونکہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب قوم ہمہ تن عمل ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب عیش اور ناز و نعمت کی نوبت آتی ہے تو ہر ہر بات میں تکلف، ساخت اور آورد پیدا ہوجاتی ہے۔ یہی زمانہ ہے جب شاعری میں مبالغہ پیدا ہوجاتا ہے''۔(۱۶)

شبلی کہتے ہیں کہ جو لوگ مبالغہ کو لازمہ شعر قرار دیتے ہیں اور شاعری سے استدلال کرتے ہیں، یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس دور کی شاعری سے مثال دیتے ہیں۔ اگر شعرائے متاخرین کی شعری مثال دی گئی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تمدن کے اثر سے نہ صرف شاعری پر برے اثرات مرتب ہوئے ہیں بلکہ لوگوں کے مذاق شعر پر بھی کہ وہ مبالغہ پسند کرنے لگے ہیں۔

شبلی اپنی تمام تر جمال پسندی کے باوجود مصلح قوم بھی تھے اور شاعری کو اعلیٰ اخلاقی کمالات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔ گویا وہ سوسائٹی پر شاعری کے اثرات کے قائل تھے اور سمجھتے تھے

کہ جو کام اس سلسلے میں شاعری سے لیا جا سکتا ہے، وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں:

''شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہوسکتا۔ علم اخلاق ایک مستقل فن ہے اور فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ ہر زبان میں اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اخلاقی تعلیم کے لیے ایک شعر ضخیم کتاب سے زیادہ کام دے سکتا ہے۔ شاعری ایک موثر چیز ہے اس لیے جو خیال اس کے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے دل میں اتر جاتا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر شاعری کے ذریعے سے اخلاقی مضامین بیان کیے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت، ہمت، غیرت، حمیت، آزادی کو اشعار کے ذریعہ سے ابھارا جائے تو کوئی اور طریقہ برابری نہیں ہوسکتا''۔(۱۷)

اخلاق کے ضمن میں حالی بھی قومی افتخار اور قومی عزت کی بات کرتے ہیں اور شبلی اسے غیریت، حمیت اور آزادی کا نام دیتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ دونوں ہی اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہیں اور اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دیگر ذرائع بھی اختیار کیے۔ خود بھی شاعری کی اور اپنی تنقید کے ذریعے اپنے دور کے شاعروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی شاعری کا ایک منصب شریفانہ اخلاق کی تعلیم بھی بتاتے ہیں۔

شبلی طرز معاشرت کے شعر و ادب پر اثرات کے بھی قائل تھے۔ ان کا عربی و فارسی شاعری کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا ذہن منطقی اور تجزیاتی بھی تھا۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مختلف ادوار کی شاعری موضوعات اور اسلوب کی سطح پر مختلف ہے تو انھوں نے اس پر غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مختلف ادوار میں تمدن میں جو تبدیلیاں آتی ہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں، عوام کی نفسیات اور طرز زیست کے ساتھ شاعری پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اسی نتیجہ ءفکر کا اظہار انھوں نے ''واقعیت'' کے ذیل میں بھی کیا ہے۔ آگے چل کر وہ ''شاعری کا تدریجی ارتقا'' کے عنوان سے بھی اسی موضوع پر لکھتے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''عرب کی اصلی شاعری اسلام سے بہت پہلے شروع ہوکر بنو امیہ کے زمانے تک